بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اِشارات

مسلمانوں کے دورِ انحطاط میں جہاں اور بہت سے فتنے پیدا ہوئے ہیں وہاں ایک بڑا اور خطرناک فتنہ تکفیر و تفسیق اور لعن کا بھی ہے ۔ لوگوں نے اسلام کے سیدھے سادھے عقائد میں موشگافیاں کیں اور قیاس و تاویل سے ان کے اندر بہت سے ایسے فروع اور جزئیات پیدا کر لیے جو ایک دوسرے سے مختلف اور متضاد تھے، اور جن کی کوئی تصریح کتاب و سنت میں نہ تھی، یا اگر تھی بھی تو اللہ اور اُس کے رسول نے ان کو کوئی اہمیت نہ دی تھی۔ پھر انھوں نے (اللہ انہیں معاف فرمائے) اپنے وضع کردہ فرعی مسائل کے ساتھ اتنا اہتمام کیا کہ انہی پر ایمان کا مدار ٹھیرا یا، اسلام کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا، بیسیوں فرقے بنا دیے، اور ہر فرقے نے ایک دوسرے کو کافر، فاسق، گمراہ، دوزخی اور خدا جانے کیا کیا کہہ ڈالا، حالانکہ کفر و اسلام کے درمیان اللہ تعالیٰ نے کتابِ مبین میں ایک واضح خطِ امتیاز کھینچ دیا تھا اور کسی کو یہ حق نہ دیا تھا کہ اپنے اختیار سے کسی چیز کو کفر اور کسی چیز کو اسلام ٹھیرا لے۔ اس فتنے کی محرک خواہ تنگ نظری ہو نیک نیتی کے ساتھ، یا خود غرضی، حسد اور نفسانیت ہو بدنیتی کے ساتھ، بہر حال اس نے جمعیت اسلامی کو جتنا نقصان پہنچایا ہے، شاید کسی اور چیز نے نہیں پہونچایا!

کسی مومن کو جو خدا اور رسول کے بتائے ہوئے ایمانیات پر اعتقاد رکھتا ہو، کافر کہد ینا درحقیقت ایک بڑی ذمہ داری کا کام ہے۔ یہ جسارت بندوں کے مقابلے میں نہیں خدا کے مقابلہ میں ہے۔ یہ خدا سے معارضہ ہے کہ جس کے حق میں خدا ایمان کا فیصلہ کرتا ہے، اس کے حق میں ایک بندۂ خدا کفر کا فیصلہ صادر کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نہایت سختی کے ساتھ تکفیر و تفسیق سے منع فرمایا ہے، اور یہاں تک فرمادیا ہے کہ جو شخص کسی کو کافر کہے گا درانحالیکہ وہ حقیقت میں کافر نہ ہو، تو وہ کفر کا فتوی خود تکفیر کرنے والے کی طرف پلٹ آئے گا۔

ایما رجلٍ قال لاخیہ یا کافر فقد باء بھا احدھما (بخاری)۔	جو شخص اپنے کسی مسلمان بھائی کو کافر کہے گا تو یہ قول دونوں میں سے کسی ایک پر ضرور پڑے گا۔
لا یرمی رجل رجلا بالفسوق ولا یرمیہ بالکفر الا ارتدت علیہ ان لم یکن صاحبہٗ کذٰلک (بخاری)۔	جب کبھی ایک شخص دوسرے شخص پر فسق یا کفر کی تہمت لگائے گا تو وہ تہمت اُسی پر پلٹ آئے گی اگر وہ شخص جس پر تہمت لگائی گئی ہے درحقیقت کافر یا فاسق نہ ہو۔
من دعا رجلا بالکفر او قال عدو اللہ ولیس کذٰلک الا حار علیہ (مسلم)۔	جس شخص نے کسی کو کافر یا دشمن خدا کہا درانحالیکہ وہ شخص ایسا نہ تھا، تو یہ قول خود قائل پر ضرور پلٹ جائے گا۔
من لعن مومنًا فھو کقتلہ ومن قذف مومنًا بکفر فھو کقتلہ (بخاری)۔	جس نے کسی مومن پر لعنت کی اس نے گویا اسے قتل کر دیا اور جس نے کسی مومن پر کفر کی تہمت لگائی اس نے گویا اسے قتل کر دیا۔

قطع نظر اس کے، مسلمانوں کی تکفیر و تفسیق ایک سنگین قومی جرم بھی ہے۔ جو شخص کسی ایک مسلمان یا مسلمانوں کے کسی گروہ پر ناحق کفر کا فتوی لگاتا ہے وہ صرف اُسی شخص یا گروہ کے حق میں ظلم نہیں کرتا بلکہ

پوری اسلامی جمعیت پر ظلم کرتا ہے اور خود اسلام کو ضرر عظیم پہنچاتا ہے۔ اس کی وجہ بادنیٰ تامل سمجھ میں آسکتی ہے

اسلامی جمعیت اور جاہلی جمعیتوں کے درمیان بنیادی فرق یہ ہے کہ جاہلی جمعیتیں رنگ، نسل، زبان، اور وطن کے رشتوں پر قائم ہوتی ہیں، اور اسلامی جمعیت کا قیام صرف دین کے رشتے پر ہے۔ جاہلی جمعیتوں میں عقائد و افکار کے اختلاف سے کوئی رخنہ نہیں پڑتا، اس لیے کہ خیالات اور اعتقادات کا اختلاف ان کے افراد کو اس رشتے سے خارج نہیں کرتا جو نسل یا وطن یا زبان یا رنگ کی وحدت سے قائم ہوتا ہے۔ باطن میں خواہ زمین و آسمان کا تفاوت ہو جائے لیکن خون کا تعلق منقطع نہیں ہو سکتا، نہ وطن کا رشتہ کٹ سکتا ہے، نہ زبان کا رابطہ منفک ہو سکتا ہے، نہ رنگ کی وحدت میں کوئی فرق آسکتا ہے۔ اس لیے اختلاف عقائد سے جاہلی جمعیتوں کو کسی قسم کا خطرہ نہیں۔ لیکن اسلام میں جو چیز مختلف النسل، مختلف اللون، مختلف اللسان اور مختلف الاوطان افراد کو جوڑ کر ایک قوم بناتی ہے، وہ عقیدہ کی وحدت کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ یہاں عقیدہ ہی سب کچھ ہے، نسل رنگ زبان وطن کچھ بھی نہیں۔ لہٰذا جو شخص دین و اعتقاد کے رشتہ کو کاٹتا ہے وہ دراصل اللہ کی اس رسی پر قینچی چلاتا ہے جس نے ایک خدا کی پرستش کرنے والوں، ایک رسول کے ماننے والوں اور ایک کتاب پر ایمان لانے والوں کو ایک دوسرے سے وابستہ کیا ہے۔ اسلام میں کسی شخص یا گروہ کو کافر کہہ دینے کے معنی صرف یہی نہیں کہ اس کے اعتقاد اور نیت پر حملہ کیا گیا، بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ اسلامی جمعیت اور اس کے ایک فرد یا چند افراد کے درمیان برادری، محبت، معاشرت، معاملت اور تعاون باہمی کے سارے رشتے کاٹ دیے گئے، اور امت مسلمہ کے جسم سے اس کے ایک عضو یا متعدد اعضاء کو چھانٹ کر پھینک دیا گیا۔

یہ فعل اگر حکم خدا و رسول کے مطابق ہو تو یقیناً حق ہے، اور سڑے ہوئے عضو کو کاٹ کر پھینک دینا ہی اسلام کے ساتھ سچی خیر خواہی ہے لیکن اگر عضو حقیقت میں سڑا ہوا نہ ہو، اور محض غلطی سے اس کو کاٹ ڈالا جائے تو یہ ظلم خود اس عضو سے بڑھ کر اس جسم پر ہوگا جس سے وہ کاٹا گیا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اللہ اور اس کے رسول نے رشتۂ دینی کے احترام کی سخت تاکید فرمائی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :-

وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ اَلْقٰی اِلَیْکُمُ السَّلٰمَ لَسْتَ مُؤْمِنًا (۴ : ۱۳)۔ جو شخص (اظہار اسلام کے لیے) تم کو سلام کرے اس کو نہ کہو کہ تو مومن نہیں ہے۔

ایک مرتبہ ایک سریہ میں ایک شخص نے مسلمانوں کو دیکھ کر کہا السلام علیکم لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔ مگر ایک مسلمان نے یہ گمان کرکے کہ اس نے محض جان بچانے کے لیے کلمہ پڑھا ہے اسے قتل کر دیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا علم ہوا تو حضورؐ اس پر سخت ناراض ہوئے اور اس مسلمان سے باز پرس کی۔ اس نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ اس شخص نے محض ہماری تلوار سے بچنے کے لیے کلمہ پڑھ دیا تھا اس پر سرکارؐ نے فرمایا ھلا شققت عن قلبہ۔ کیا تو نے اس کا دل چیر کر دیکھا تھا؟

ایک صحابی نے پوچھا کہ اگر ایک شخص مجھ پر حملہ کرکے میرا ہاتھ کاٹ ڈالے، اور جب میں اس پر حملہ کروں تو وہ کلمہ پڑھ لے۔ کیا ایسی حالت میں اس کو قتل کر سکتا ہوں؟ حضورؐ نے فرمایا نہیں۔ صحابی نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ اس نے تو میرا ہاتھ کاٹ دیا۔ آپؐ نے فرمایا باوجود اس کے تم اس کو نہیں مار سکتے۔ اگر تم نے اس کو مارا تو وہ اس مرتبے میں ہوگا جس میں تم اس کے قتل سے پہلے تھے اور تم اس مرتبے میں ہو جاؤ گے جس میں وہ کلمہ لا الٰہ الا اللہ کہنے سے پہلے تھا۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا اگر کوئی شخص کسی کافر پر نیزہ تانے اور جب سنان اس کے حلق تک پہنچ جائے اس وقت وہ لا الٰہ الا اللہ کہدے، تو مسلمان کو لازم ہے کہ فوراً اپنے نیزہ کو واپس کھینچ لے۔

ایک دوسری حدیث میں ہے کہ مسلمان کو گالی دینا فسق ہے اور مسلمان سے لڑنا کفر۔

یہ سب کچھ اس لیے ارشاد فرمایا گیا ہے کہ مسلمانوں کی قوت اور جمعیت کا قیام، رابطۂ دینی کے سوا کسی دوسری چیز سے نہیں ہے۔ اگر مسلمانوں میں اس رابطہ کا احترام نہ ہو، اور وہ بات بات پر اس کو کاٹنے لگیں تو امت کا سارا شیرازہ بکھر کر رہ جائے۔ اور اُس قوم کی کوئی اجتماعی قوت باقی ہی نہ رہے جو باطل پرستوں کے مقابلے میں اللہ کا کلمہ بلند کرنے اور خیر و تقویٰ کی طرف دعوت دینے کے لیے قائم کی گئی ہے۔

ہمارا یہ منشا نہیں کہ تکفیر و تفسیق سے مطلقاً پرہیز کیا جائے حتیٰ کہ اگر کوئی شخص صریح کفریات بکنے اور لکھنے لگے، تب بھی اس کو مسلمان کہا اور سمجھا جاتا رہے۔ یہ منشا نہ کتاب و سنت کی مندرجہ بالا نصوص کا ہے نہ ہماری تقریر گذشتہ کا۔ اور یہ ہو بھی کیسے سکتا ہے؟ اس لیے کہ کسی مسلمان کو اسلام سے خارج کر جس قدر نقصان دہ ہے کسی کافر کو اسلامی جمعیت میں شامل کرنا بھی اس سے کچھ کم نقصان دہ نہیں۔ ہم جو کچھ کہنا چاہتے ہیں وہ صرف یہ ہے کہ مسلمان کی تکفیر کے معاملہ میں انتہا درجہ کی احتیاط ملحوظ رکھنی چاہیے، اتنی ہی احتیاط جتنی ایک شخص کے قتل کا فتویٰ صادر کرنے میں ملحوظ رکھی جاتی ہے۔ ہر شخص جو مسلمان اور لا الٰہ الا اللہ کا قائل ہے اس کے حق میں یہی گمان ہونا چاہیے کہ اس کے دل میں ایمان ہے۔ اگر وہ کوئی ایسی بات کرتا ہے جس میں کفر کا شائبہ پایا جاتا ہو، تو اس کے حق میں یہ امید رکھنی چاہیے کہ اس نے کفر کے ارادے سے ایسی بات نہ کی ہوگی، بلکہ محض جہل اور ناسمجھی سے کی ہوگی۔ اس لیے بو ہلۂ اول اس پر کفر کا حکم لگانے کے بجائے قولِ جمیل سے اس کو سمجھانے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اگر وہ پھر بھی نہ مانے اور اپنی بات پر اصرار کرے، تو اس بات کو جس پر وہ اصرار کر رہا ہے کتاب اللہ پر پیش کر کے دیکھنا چاہیے کہ آیا وہ کفر و ایمان کے درمیان فرق کرنے والی صریح نصوص کے خلاف ہے یا نہیں؟ اور اس شخص کے زیر بحث قول یا فعل میں کسی تاویل کی گنجایش ہے یا نہیں؟ اگر صریح نصوص کے خلاف نہ ہو اور تاویل کی گنجایش ہو تو کفر کا حکم نہیں لگایا جا سکتا زیادہ سے زیادہ ایسے شخص کو گمراہ کہا جا سکتا ہے، اور وہ بھی اس خاص مسئلہ میں، نہ کہ بالکلیہ۔ البتہ اگر

اس کا اعتقاد نص صریح کے خلاف ہو، اور وہ شخص یہ معلوم کرنے کے بعد بھی کہ اس کا اعتقاد کتاب اللہ کی تعلیم کے خلاف ہے اپنی بات پر قائم رہے، اور اس کے قول کی کوئی ایسی تاویل کی ہی نہ جا سکتی ہو جس سے کسی طور پر اس کو کتاب اللہ کے مطابق کیا جا سکتا ہو، تو ایسی صورت میں مسئلہ کی نوعیت کا لحاظ کرتے ہوئے فسق یا کفر کا حکم لگایا جا سکتا ہے۔ لیکن یہاں بھی مدارج و مراتب کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔ تمام جرم اور تمام مجرم یکساں نہیں ہیں۔ ان میں بھی فرق مراتب ہوتا ہے اور انصاف کا مقتضیٰ یہ ہے کہ اس فرق کو ملحوظ رکھکر سزا تجویز کی جائے۔ سب کو ایک ہی لکڑی سے ہانکنا یقیناً بے انصافی ہے۔

کفر و اسلام کا ایک پہلو باطنی ہے اور ایک ظاہری۔ باطن کا تعلق انسان کے دل اور اس کی نیت سے ہے، اور ظاہر کا تعلق اس کی زبان اور عمل سے۔ ہم ایک حد تک آدمی کے قول و فعل سے بھی اس کی حالت کا اندازہ کر سکتے ہیں اگر یہ محض قیاس و گمان ہوگا، علم اور یقین نہ ہوگا، اور علم و یقین کے بغیر صرف قیاس و گمان کی بنا پر کسی کے ایمان یا کفر کا فیصلہ کرنا، یقیناً ظلم ہے، اگرچہ ایسا فیصلہ نفس الامر کے مطابق ہی کیوں نہ ہو۔ لہٰذا حق یہی ہے کہ ایمان کا معاملہ اللہ پر چھوڑ دیا جائے کیونکہ اس کے سوا کوئی نہیں جان سکتا کہ کس کے دل میں ایمان ہے اور کس کے دل میں ایمان نہیں ہے۔ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ وَهُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اهْتَدٰى (۵۳ : ۲)۔ ہماری نظر صرف ظاہر تک جا سکتی ہے، اور صرف ظاہری اقوال و افعال ہی کو دیکھ کر ہم رائے قائم کر سکتے ہیں کہ کون مسلمان ہے اور کون نہیں ہو سکتا ہے کہ جو شخص ظاہر میں جہالت و نادانی سے کفریات بک رہا ہے وہ باطن میں سچا اور پکا مومن ہو اور اس کے دل میں خدا اور رسول کی محبت بہت سے واعظوں اور مرشدوں سے بڑھ کر ہو۔ اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ جو شخص زور شور کے ساتھ اپنے ایمان کا اعلان کرتا ہے، اور احکام شریعت کی پابندی میں اہتمام بھی کرتا ہے، وہ محض ایک ریاکار منافق ہو۔ لہٰذا ظاہر کی بنا پر کسی کے کفر اور اسلام کا فیصلہ

کرتے ہوئے، انسان کو خدا کی پکڑ سے بہت ڈرنا چاہیے، اور ایسا فیصلہ کرنے سے پہلے ہزار مرتبہ سوچ لینا چاہیے کہ وہ کیسی ذمہ داری اپنے سر لے رہا ہے، اور کیا ایسے معقول وجوہ موجود ہیں جن کی بنا پر اس ذمہ داری سے بچنے کی بہ نسبت اس کا اٹھا لینا زیادہ بہتر ہے۔

یہ ظاہر ہے کہ انسانوں کی طبائع، استعدادات، اور عقلی صلاحیتیں مختلف ہیں۔ بعض لوگ نہایت سادہ لوح ہوتے ہیں، ایک سیدھی سادھی بات کو اجمالی طور پر مان لیتے ہیں، تفصیلات اور باریکیوں کو سمجھنے کی نہ ان میں قابلیت ہوتی ہے، نہ وہ ان کے طالب ہوتے ہیں۔ برعکس اس کے بعض لوگوں میں غور و فکر کا مادہ ہوتا ہے۔ اجمال سے ان کی تشفی نہیں ہوتی۔ تفصیلات ڈھونڈتے ہیں، اور نہیں ملیں تو پیدا کرتے ہیں۔ پھر غور و فکر کرنے والوں کے رجحانات اور مدارج عقلی بھی بے شمار ہیں۔ کسی کا میلان شک کی طرف ہوتا ہے، اور کسی کا یقین کی طرف۔ کوئی مادیات و محسوسات پر فریفتہ ہوتا ہے، اور کوئی معقولات پر۔ کوئی بات کی تہ تک پہنچ جاتا ہے، اور کوئی پیچ کی راہوں میں بھٹک کر رہ جاتا ہے۔ کوئی حقیقت پسند (Realist) ہوتا ہے، اور کسی کو وہم و خیال کی وادیوں میں گھومنا ہی اچھا معلوم ہوتا ہے۔ غرض نظر و فکر کے بے شمار راستے ہیں جن کو انسانی اذہان اپنی اپنی افتاد طبع کے مطابق اختیار کرتے ہیں، اور کسی انسان میں یہ طاقت نہیں کہ وہ کسی انسان کی طبعی افتاد اور فطری رجحان اور عقلی استعداد کو بدل دے۔

جس خدا نے اسلام کو تمام نوع انسانی کی ہدایت کے لیئے نازل کیا ہے اس سے بڑھ کر انسانی فطرت کے ان اختلافات کو جاننے والا، اور ان کی رعایت ملحوظ رکھنے والا اور کون ہو سکتا تھا؟ یہی وجہ ہے کہ اس نے اپنے پسندیدہ دین کی بنیاد ایسے سادہ اور مجمل عقائد پر رکھی ہے جنھیں ایک کم عقل

دہقان ہے کہ ایک نکتہ سنج فلسفی اور ایک حقیقت طلب طبیعی تک سب قبول کر سکتے ہیں۔ ان عقائد کی سادگی اور ان کا اجمال ہی وہ چیز ہے جس نے ان کو ایک عالمگیر انسانی مذہب کے لیے بنیادی اصول بننے کے قابل بنایا ہے۔ جو شخص غور و فکر کی صلاحیت نہیں رکھتا اس کے لیے صرف اتنا مان لینا ہی کافی ہے کہ خدا ایک ہے، محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے رسول ہیں، قرآن اس کی کتاب ہے، اور قیامت کے روز ہمیں اس کے سامنے حاضر ہونا ہے۔ اور جو شخص فکر و تدبیر کی قوت رکھتا ہے کہ اس کے لیے اس اجمال میں اتنی وسعتیں ہیں کہ وہ اپنی استعداد عقلی اور اپنے رجحان طبع کے مطابق جستجوئے حقیقت کے لیے جو راہ چاہے اختیار کر سکتا ہے۔ اور جتنی دور چاہے جا سکتا ہے۔

وہ خواہ کوئی راہ اختیار کرے، اور کتنی ہی دور تک چلا جائے، جب تک وہ ان حدود کے اندر مقید ہے جو کلام اللہ نے اسلام اور کفر کے درمیان کھینچ دی ہیں، اس وقت تک وہ دائرۂ ایمان سے خارج نہیں ہو سکتا۔ مثال کے طور پر ایمان باللہ کے مسئلہ میں ملاک امر صرف یہ ہے کہ کائنات کا بنانے اور چلانے والا ایک خدا ہے اور وہی اس لائق ہے کہ اس کی بندگی کی جائے۔ اس بات کو ایک سیدھا سادھا کسان جس طور پر مان سکتا ہے، ممکن نہیں کہ ایک غور و فکر کرنے والا آدمی اسی طرح مان لے۔ پھر ایک خاص طرح کا رجحان طبع رکھنے والا آدمی اس میں تدبر کر کے خدا کی ہستی اور اس کی صفات اور کائنات کے ساتھ اس کے تعلق کی کیفیت کے متعلق جو تفصیلی تصورات اپنے ذہن میں قائم کرے گا، ممکن نہیں کہ ان امور کے متعلق ایک دوسری طرح کا رجحان رکھنے والے آدمی کے تصورات بالکل اس کے مطابق ہوں لیکن جب تک یہ سب اس بنیادی عقیدے پر ایمان رکھتے ہیں، سب کے سب مسلمان ہیں، خواہ تفصیلات میں ان کے تفکرات، حقیقت نفس الامری تک پہنچنے میں کتنے ہی ناکام ہوئے ہوں۔ اسی طرح وحی، رسالت، ملائکہ اور یوم آخر کے متعلق بھی اسلامی عقائد میں چند اصولی ہیں جن کو دین کی ضروریات (Essentials) کہنا چاہیے، اور باقی

تفصیلات ہیں جن میں سے بعض کے لیے انسان کو کلام اللہ میں صحیح یا قابل تاویل اشارات مل جاتے ہیں اور بعض کو انسان خود اپنے رجحان طبع کے مطابق اپنے ذہن سے پیدا کرلیتا ہے۔ بہت ممکن ہے کہ ان میں سے اکثر تفصیلات کا حکم لگانے میں انسان کی عقل غلطی کرے، اور اس کے تصورات حقیقت سے بہت دور جا پڑیں، لیکن جب تک وہ ان عقائد میں ملاک امر کا سررشتہ ہاتھ سے نہیں چھوڑتا عقل و فکر کی کوئی گمراہی اس کو دائرۂ دین سے خارج نہیں کرسکتی، چاہے مرکز دین سے اس کو کتنا ہی بعد ہوجائے۔

اسلام میں فرقوں کی پیداوار کا اصل سبب یہی ہے کہ کلام اللہ میں اصول و ضروریات دین کے متعلق جو مجمل اور بسیط تصورات پیش کیے گئے ہیں، اور کہیں کہیں ان کی تفصیل میں جو لطیف اشارات کردیے گئے ہیں، ان کو سمجھنے میں مختلف لوگوں نے اپنی عقلی استعدادات اور طبعی رجحانات کی بناء پر قیاس و استدلال کے ذریعہ سے جزئیات اخذ کرلیے ہیں جو ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ اس حد تک تو کچھ مضائقہ نہ تھا۔ اور اس میں بھی کوئی خرابی نہ تھی کہ ایک گروہ صرف اپنے مسلک کو حق سمجھتا اور دوسرے گروہوں سے بحث کرکے ان کو اپنے مسلک کی طرف لانے کی کوشش کرتا لیکن غضب یہ ہوا کہ لوگوں نے اپنے قیاسی و تاویلی عقائد کو بھی اصول و ضروریات دین میں شامل کرلیا، اور اس بنا پر ہر ایک جماعت نے ان تمام جماعتوں کی تکفیر کی جو ان عقائد کو نہ مانتی تھیں۔ یہیں سے حرب عقائد کی ابتدا ہوتی ہے اور یہی ظلم کا نقطۂ آغاز ہے۔ یہ صحیح ہے کہ عقائد اسلام میں قیاسات و تاویلات سے جو راہیں اختیار کی گئی ہیں ان میں سے بہت سی راہیں غلط ہیں لیکن ہر غلطی حتماً اور لازماً کفر تو نہیں ہے۔ غلطی کو غلطی کہنا، اور اس کا ارتکاب کرنے والے کو گمراہ اور غلط کار سمجھنا اور اس کو راہ راست پر لانے کی کوشش کرنا بلاشبہ جائز ہے۔ لیکن جب تک کوئی شخص اس نفس حقیقت کا

انکار نہیں کرتا جس پر اللہ تعالیٰ نے ایمان لانے کا حکم دیا ہے، اس کو کافر کہنا کسی طرح بھی جائز نہیں، خواہ اس کی گمراہی کتنی ہی بڑھ گئی ہو۔

افسوس ہے کہ علماء متاخرین نے اصل اور فرع، نص اور تاویل کے فرق کو نظر انداز کر دیا ہے۔ وہ ان فروع کو بھی اصول سمجھنے لگے ہیں جن کو انہوں نے اپنی مخصوص فہم کی بنا پر اصول سے اخذ کیا ہے۔ وہ ان تاویلات کو بھی نصوص کے درجے میں رکھتے ہیں جو انہوں نے نصوص سے معانی اخذ کرنے میں اختیار کی ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ اپنے فروع اور اپنی تاویلات کے منکر کو بھی اسی طرح کافر قرار دیتے ہیں جس طرح اصول اور نصوص کے منکر کو قرار دیا جاتا ہے۔

اس بے اعتدالی نے پہلے تو اسلامی جمعیت میں صرف تفرقہ ہی پیدا کیا تھا۔ مگر اب ہم دیکھ رہے ہیں کہ علماء کی یہ کافرگری مسلمانوں کے دلوں میں نہ صرف علماء کی طرف سے، بلکہ خود اس مذہب کی طرف سے بھی بدگمانیاں پیدا کر رہی ہے جس کی نمایندگی یہ علماء کرتے ہیں۔ روز بروز علماء کا اقتدار مسلمانوں کے سے اٹھتا جا رہا ہے۔ ان کی باتیں سن کر دل مذہب کی طرف راغب ہونے کے بجائے اس سے دُور بھاگنے لگے ہیں۔ اور عام طور پر مذہبی مجلسوں اور مذہبی تحریروں کے متعلق یہ گمان پیدا ہو گیا ہے کہ ان میں آپس کی لڑائیوں کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ اس زمانہ میں عام مسلمانوں کو مذہبی علوم کی واقفیت بہم پہنچانے کا یہی ایک ذریعہ رہ گیا تھا، سو یہ اس کافرگری کے صدقہ میں ہاتھ سے نکلا جا رہا ہے۔ مسلمانوں میں مذہب سے ناواقفیت اور گمراہی کے پھیلنے کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے۔ کاش ہمارے علماء اپنی اس غلطی کو محسوس کریں اور اسلام اور مسلمانوں پر نہیں تو خود اپنے اوپر ہی رحم کر کے اس روش سے باز آ جائیں جس نے ان کو اپنی قوم میں اس قدر رسوا کر دیا ہے، درانحالیکہ یہی وہ قوم تھی جو کبھی ان کو سر آنکھوں پر بٹھاتی تھی۔